ڈاکٹر شیخ محمد اکرام

الغزالیؒ

اسلامی دنیا کی فکری تاریخ میں حجۃ الاسلام امام محمدؒ غزالیؒ کو ایک بڑا بلند، بلکہ ایک منفرد مقام حاصل ہے۔ برصغیر پاک و ہند و ستان کے خاص حالات کے تابع جو کام زیادہ تفصیل (اور حدیث کی بہتر واقفیت اور قرآن کریم کی زیادہ فیض رسانی کے ساتھ) شاہ ولی اللہؒ نے اس سرزمین میں کیا تقریب قریب وہی کام، زیادہ وسیع پیمانے پر، سارے عالمِ اسلام کے لیے امام غزالیؒ نے سرانجام دیا۔

مسلمانوں کی دینی اور فکری تاریخ میں سربفلک چوٹیوں کی کمی نہیں۔ لیکن اسلام کی پہلی تین چار صدیوں کے بعد، بالعموم، انہی ہستیوں نے فروغ پایا جن کی نظر اسلامی نظامِ فکر کو ترقی دینے، اس میں متحرک اور توانا زندگی کی روح برقرار رکھنے، اور اس کے بند ہونے والے فکری اور روحانی سوتوں کو جاری کرنے پر اس قدر نہ تھی، جتنی اس نظام کو اس صورت میں برقرار رکھنے میں، جو انھیں اپنے بزرگوں سے حاصل ہوئی تھی۔ قومی ذہنیت کی تشکیل و بقا میں اس نقطۂ نظر کی بڑی اہمیت ہے۔ اور بالخصوص جب قومی زندگی کو انتشار کا سامنا ہو۔ (مثلاً دورِ عباسیہ میں معتزلہ کی زیادتیوں کے زمانے میں یا ہمارے ہاں عہد اکبری میں) تو یہ طریق کار مفید، بلکہ فرض عین ہو جاتا ہے۔ لیکن اگر اسے ذہنی زندگی کا بنیادی اور ہمہ وقتی اصول بنا لیں تو ظاہر ہے کہ علمی ترقی کا راستہ بند ہو جاتا ہے اور عقلی نشو و نما کی طاقت سلب ہو جاتی ہے۔

چوتھی صدی سے، بالعموم، عالم اسلام میں تقلید اور تحدید و تقلیل علم کا رجحان غالب آیا۔ جو من چلے اس روش کے خلاف چلے، ان کے قدم جادۂ اعتدال سے اس طرح دور جا پڑے کہ قومی زندگی سے ان کا رشتہ منقطع ہو گیا۔ اور ان کی کوششوں سے کوئی مفید نتیجہ برآمد نہ ہوا۔ کامیاب قومی اصلاح کا راستہ بڑا کٹھن اور حوصلہ فرسا ہے۔ اس کے لیے بے عیب زندگی، انتہائی جرأت بڑی قابلیت، غیر معمولی سمجھ اور ایثار کی ضرورت ہے۔ خوش قسمتی سے امام غزالی میں یہ ساری

خوبیاں موجود تھیں۔ ان کی قابلیت کا یہ عالم تھا کہ چونتیس برس کی عمر میں دنیائے اسلام کے سب سے ممتاز دارالعلوم مدرسۂ نظامیہ بغداد کے صدر مدرس مقرر ہوئے۔ اسی سن میں ان کی تصانیف شہرۂ آفاق تھیں۔ اس زمانے میں بغداد میں مناظرے کثرت سے ہوتے تھے۔ "امام غزالی نظام الملک کے دربار میں پہنچے تو سینکڑوں اہل کمال کا مجمع تھا۔ نظام الملک نے مناظرہ کی مجلسیں منعقد کیں۔ متعدد جلسے ہوئے۔ اور مختلف مضامین پر بحثیں رہیں۔ ہر معرکہ میں امام صاحب ہی غالب رہے۔[۵۱]" ان کے علم و فضل اور قابلیت کا یہ اثر ہوا کہ "ارکان سلطنت کے ہمسر بن گئے۔ بلکہ جیسا کہ سبکی نے طبقات میں لکھا ہے، ان کے جاہ و جلال نے وزرا اور امرا کو بھی دبا لیا۔ یہاں تک کہ سلطنت کے اہم اور مہتم بالشان معاملات ان کی شرکت کے بغیر سرانجام نہیں پا سکتے تھے۔[۵۲]"

اس قابلیت اور اقتدار و اثر کے ساتھ ساتھ ذہنی دیانت اور پاکیزگیٔ نفس کا یہ عالم تھا کہ جب اپنے ماحول میں نیکی اور سچائی نہ دیکھی۔ اور مروجہ علوم سے طبیعت کی تسکین نہ ہوئی تو سب جاہ و عظمت چھوڑ چھاڑ کر بغداد سے نکل کھڑے ہوئے۔ قریباً دس بارہ سال تک رہ نوردی کی۔ دمشق، بیت المقدس، مکہ معظمہ اور مدینہ منورہ میں طویل قیام رہا۔ زیادہ وقت عبادت، اور مجاہدہ و ریاضت میں صرف ہوا۔ لیکن علمی اشغال بھی ترک نہ ہوئے۔ دمشق کی جامع اموی میں اسی اثنا میں درس دیا۔ اور احیاء العلوم کی تصنیف بھی اسی زمانے سے منسوب کی جاتی ہے۔

امام صاحب نے اپنی روحانی کش مکش اور تلاش حق کی سرگزشت المنقذ من الضلال میں بیان کی ہے، جس کا کئی مشرقی اور مغربی زبانوں میں ترجمہ ہو چکا ہے۔ عجب دلآویز اور سبق آموز دستاویز ہے۔ سطر سطر سے لکھنے والے کی دیانت، بصیرت اور علمیت ٹپکتی ہے اور اس زمانے کے علمی اور دینی ماحول پر بھی روشنی پڑتی ہے۔

جب برسوں کے مجاہدات اور غور و فکر کے بعد طبیعت کو قرار آیا۔ اور شک و شبہے جاتے رہے تو ارادہ کیا کہ عزلت کے دائرے سے نکلیں۔ چنانچہ ذی قعدہ ۴۹۹ھ میں نیشاپور کے مدرسۂ نظامیہ

---

۵۱ الغزالی ص ۲۸ ۵۲ ایضاً ص ۳۰

میں مسند درس کو زینت دی۔ امام صاحب کو اس پر آمادہ کرنے میں نظام الملک کے بیٹے فخر الملک کو بڑا دخل تھا۔ اگلے سال وہ ایک باطنی کے ہاتھ سے شہید ہوا، اور اس کی وفات کے تھوڑے ہی دن بعد امام صاحب نے نظامیہ نیشاپور سے کنارہ کشی کر کے طوس میں خانہ نشینی اختیار کی۔ اور گھر کے پاس ایک مدرسہ اور خانقاہ کی بنا قائم کر کے ظاہری اور باطنی علوم کی تلقین اور تصنیف و تالیف کا سلسلہ جاری کیا۔

بغداد میں جب امام صاحب کے گوشۂ عزلت ترک کرنے کی خبر عام ہوئی تو لوگوں نے خلیفۂ وقت سے التجا کی کہ امام غزالی کو نظامیہ بغداد میں درس کے لیے بلایا جائے۔ چنانچہ دربارِ خلافت سے انھیں بلاوا گیا۔ وزیر اعظم نے ایک علٰحدہ خط لکھا۔ لیکن امام صاحب نے جانے سے انکار کر دیا۔ اور جواب میں ایک طویل خط لکھا۔ جس میں بغداد نہ آنے کے متعدد عذر درج کیے۔ اس میں یہ لکھا کہ (۱) یہاں میرے پاس ڈیڑھ سو طلبا زیرِ تعلیم ہیں، ان کے لیے بغداد آنا مشکل ہوگا۔ اور (۲) اب میرے ساتھ بال بچے بھی ہیں، جو ترکِ وطن کی زحمت نہیں اٹھا سکتے۔ انھوں نے تین اور عذرات لکھے ہیں جو ان کے عزائم اور حالاتِ عصر پر روشنی ڈالتے ہیں:

تیسرے یہ کہ میں نے مقام خلیل میں عہد کیا ہے کہ کبھی مناظرہ و مباحثہ نہ کروں گا۔ اور بغداد میں مباحثہ کے بغیر چارہ نہیں۔

اس کے سوا دربارِ خلافت میں سلام کرنے کے لیے حاضر ہونا ہوگا۔ اور میں اس کو گوارا نہیں کر سکتا۔

سب سے بڑھ کر یہ کہ میں مشاہرہ اور وظیفہ قبول نہیں کر سکتا۔ اور بغداد میں میری کوئی جائداد نہیں[۵۳]

دربارِ خلافت سے تقاضے آتے رہے۔ لیکن امام صاحب پر کوئی اثر نہ ہوا۔ وہ اپنے گوشۂ عافیت میں عبادت اور علمی کاموں میں مشغول رہے۔ حتیٰ کہ ۱۴ جمادی الثانی ۵۰۵ھ میں داعیٔ اجل کو لبیک کہا۔

مندرجہ بالا حالات الغزالی کے حصۂ اوّل سے ماخوذ ہیں۔ حصہ دوم کے شروع میں مصنف امام صاحب کی نسبت لکھتے ہیں: "انھوں نے کل ۵۴، ۵۵ برس کی عمر پائی ..... دس گیارہ برس

---

۵۳ ایضاً ص ۵۲

صحرا نوردی اور بادیہ پیمائی میں گزرے۔ درس و تدریس کا شغل ہمیشہ قائم رہا۔ . . . . فقر و تصوف کے مشغلے جُدا۔ دور دور سے جو فتاوے آتے تھے، ان کا جواب لکھنا الگ۔ بایں ہمہ سینکڑوں کتابیں تصنیف کیں۔" شبلی نے اٹھہتر کتابوں کے نام لکھے ہیں۔ جن میں سے ایک کتاب (یاقوت التاویل فی التفسیر) ۴۰ جلدوں میں ہے۔ ظاہر ہے کہ ایک قلیل مدت حیات میں اس فراوانی تصانیف کے ساتھ یکساں معیار بلند نہیں رہ سکتا۔ اس کے علاوہ ان کی ذہنی زندگی بلکہ طبعی میلانات میں بھی تغیر و تبدل اور نشوونما کی کئی منزلیں ہیں۔ اگر اس ارتقا اور تصانیف کی تاریخی ترتیب کو نظر انداز کر دیں تو ان میں کئی جگہ تناقض نظر آتا ہے۔ بعض علوم میں انھیں پوری مہارت نہ تھی۔ علم حدیث کو تو انھوں نے بالکل آخر عمر میں حاصل کیا۔ اس کے علاوہ اس زمانے میں تاریخی تنقید اور جرح و قدح کے معیار اتنے کڑے نہ تھے، جتنے آج کل ہیں۔ چنانچہ غزالی کی کتابوں میں کئی ایسے اندراجات احادیث یا[لہ] مستند واقعات کے طور پر ملتے ہیں جن کی صحت قبول کرنا مشکل ہے۔ لیکن جیسا کہ علامہ شبلی نے الغزالی کے بالکل آخر میں لکھا ہے "بہر حال امام صاحب امام تھے۔ پیغمبر نہ تھے۔ اور پیغمبر کے سوا کسی کو عصمت کا رتبہ حاصل نہیں ہو سکتا۔" لیکن اگر ان نا تمامیوں سے گزر کر امام غزالی کی مثبت خوبیوں کا مطالعہ کریں تو ایک بڑی دل کش، لائق صد احترام شخصیت نظر آتی ہے۔ اور ان کی محبت دینی جرأت، قابلیت، بصیرت اور انسان دوستی پر بے ساختہ دل سے آفرین نکلتی ہے، جن کی بدولت مسلمانوں کی ذہنی اور روحانی زندگی میں اس قدر وسعت، گہرائی، ٹھہراؤ اور توازن کا اضافہ ہوا۔

علامہ شبلی نے امام صاحب کی مشہور تصانیف کو مضامین کے لحاظ سے ترتیب دیا ہے۔ یوں تو انھوں نے زمین علم کی کتنی کھیتیوں مثلاً ـــ فقہ، اصول فقہ، کلام، منطق، فلسفہ وغیرہ کو سیراب کیا۔ لیکن ان کی محنتوں کا اصل میدان تصوف و اخلاق تھا۔ جس میں انھوں نے احیاء العلوم، کیمیائے سعادت، اخلاق الابرار، نصیحت الملوک، مشکوٰۃ الانوار جیسے شاہکار چھوڑے ہیں۔ اور توقع بھی یہی ہوتی ہے کہ جس نیک نیت، بلند ہمت ہستی نے اپنے صفائے باطن کے لیے بارہ سال دشت نوردی کی ہو، اور چلّے کاٹے ہوں، اس کی سب سے زیادہ کوشش دوسروں کی باطنی اصلاح اور اخلاقی و روحانی

لہ علامہ شبلی لکھتے ہیں کہ احیاء العلوم کی احادیث و آثار کا تمام تر حصہ (ابو طالب مکی) کی قوت القلوب سے لیا گیا ہے۔ (الغزالی ص ۴۹)۔

سربلندی کے لیے وقف ہو گی۔ لیکن امام صاحب کے ان کارناموں کی تفصیل دینے سے پہلے مناسب معلوم ہوتا ہے کہ ان کی خالص دینی خدمات کا ذکر کر دیا جائے۔

امام غزالی سے ایک تفسیر منسوب کی جاتی ہے جو عام شہرت کے مطابق چالیس جلدوں میں مکمل ہوئی لیکن علامہ شبلی کی تحقیقات کے مطابق اس کا وجود فرضی ہے۔ (الغزالی ص ۷۳)۔ فقہ اور اصول فقہ میں البتہ امام غزالی کی متعدد اعلیٰ درجے کی تصانیف ہیں۔ امام صاحب شافعی تھے۔ اور شبلی لکھتے ہیں "فقہ میں ان کی چاروں تصنیفات یعنی بسیط، وسیط، وجیز اور وسائل فقہ شافعی کے چار ارکان ہیں۔" (ص ۷۴)۔ علم الکلام میں ان کا مقام اس سے بھی بلند ہے۔ اور غالباً ان کے متکلمانہ کارنامے تھے جن کی وجہ سے "ان کی زندگی ہی میں ان کو حجۃ الاسلام کا لقب دیا گیا۔ جو آج تک قائم ہے۔" شبلی نے ان کارناموں کو "نہایت تفصیل" کے ساتھ بیان کیا ہے۔ اس سلسلے میں ان کی سب سے مشہور کتاب تہافت الفلاسفہ یعنی فلاسفہ کی گمراہی ہے جس میں انھوں نے ان فلاسفروں کی تردید کی ہے جو عقل و ذہن اور حکمت و فلسفہ کے زعم میں مذہب کو باطل اور غیر ضروری سمجھتے تھے۔ اس سلسلے میں امام صاحب کے مقصدِ تالیف کا جو خلاصہ شبلی نے تہافہ کے مقدمہ سے الغزالی میں درج کیا ہے، وہ تمام کا تمام دیکھنے سے تعلق رکھتا ہے۔ فرماتے ہیں:

"ہمارے زمانہ میں ایسے لوگ پیدا ہو گئے ہیں، جن کو زعم ہے کہ ان کا دل دماغ عام آدمیوں سے ممتاز ہے۔ یہ لوگ مذہبی احکام اور فقیہ کو حقارت کی نگاہ سے دیکھتے ہیں۔ ان کا خیال ہے کہ حکمائے قدیم مثلاً افلاطون ارسطو وغیرہ مذہب کو لغو سمجھتے تھے۔ اور چونکہ یہ حکما تمام علوم و فنون کے بانی اور موجد تھے۔ اور عقل و ذہن میں ان کا کوئی ہمسر نہیں ہوا۔ اس لیے ان کا انکار مذہب اس بات کی بیّن دلیل ہے کہ مذہب حقیقت میں لغو اور اس کے اصول و قواعد فرضی اور مصنوعی ہیں۔ جو صرف ظاہر میں خوش نما اور دلفریب ہیں۔

اس بنا پر میں نے ارادہ کیا کہ ان حکما نے الٰہیات پر جو کچھ لکھا ہے، ان کی غلطیاں دکھاؤں۔ اور ثابت کروں کہ ان کے مسائل اور اصول بازیچۂ اطفال ہیں۔" (ص ۱۵۲-۱۵۳)۔

تہافتہ الفلاسفہ کی نسبت علامہ شبلی کا خیال ہے کہ "امام صاحب کی یہ محنت چنداں سودمند نہ ہوئی۔" (ص ۱۵۴)۔ لیکن انھیں بھی اعتراف ہے کہ اس کتاب نے "فلسفۂ یونانی کی عظمت دلوں سے دور کر دی۔ اور لوگ اس کے عیب و ہنر کی جانچ کی طرف متوجہ ہو گئے۔" تہافتہ الفلاسفہ

کا علمی دنیا میں اتنا اثر تھا کہ مشہور فلسفی ابن رشد کو اس کے جواب میں تہافۃ التہافۃ لکھنے کی ضرورت محسوس ہوئی۔ اور اس کی افادیت کا اندازہ اس سے ہو سکتا ہے کہ جب عہد اکبری میں یہاں بھی اسی قسم کی صورت حالات پیدا ہو گئی، جس کا ذکر امام غزالی نے تہافۃ الفلاسفۃ کی تمہید میں اپنے زمانے کے متعلق کیا تھا اور حکمت و فلسفہ کے دعویداروں نے نبوت کی ضرورت کے متعلق بحثیں شروع کر دیں تو حضرت مجدد الف ثانیؒ نے ان کی تردید میں جو رسالے (مثلاً اثبات النبوت) اور مکاتیب لکھے۔ ان میں بیشتر امام غزالیؒ کی تصانیف پر انحصار کیا ہے۔ اور جا بجا ان کی کتابوں کے حوالے اور اقتباسات دیے ہیں۔

فلسفہ کی تردید اور مذہب کی ضرورت اور سچائی ثابت کرنے کے علاوہ امام صاحب کا ایک اہم کام فرقۂ باطنیہ کا ابطال تھا۔ وہ اس مقصد میں اتنے کامیاب ہوئے کہ آج اس امر کا اندازہ ہی نہیں ہو سکتا کہ ایک زمانے میں یہ فرقہ دینی یک جہتی کے لیے کتنا بڑا خطرہ بن گیا تھا اور اس کے ماننے والوں نے عالم اسلام میں کس طرح تہلکہ مچا رکھا تھا۔ اس زمانے میں حسن بن صباح نے اس فرقہ کی نئے سرے سے تنظیم کی تھی۔ اس کے داعی تمام اسلامی ملکوں میں پھیلے ہوئے تھے۔ اشاعت عقیدہ کے لیے نیا طریقہ وضع کیا۔ یعنی مختلف طبقوں سے ان کی حالت اور ضرورت کے مطابق جداگانہ انداز خطاب اختیار کیا جاتا۔ سب سے بڑھ کر یہ کہ جس حاکم یا مدبر کو اپنے کاموں میں مخل سمجھا جاتا، وہ کسی فدائی کے تیر و خنجر کا شکار ہو جاتا۔ اس زمانے میں نظام الملک کا جو مرتبہ اسلامی دنیا میں تھا، محتاج تفصیل نہیں۔ وہ سلجوقی خاندان کا وزیر با اقتدار تھا۔ علم کی اس نے جس طرح خدمت و سرپرستی کی، وہ بغداد، نیشاپور وغیرہ کے نظامیہ مدرسوں سے ظاہر ہے۔ اس کا اپنا سیاست نامہ عہد وسطیٰ کے شاہکاروں میں سے ہے۔ لیکن باطنیوں کی نظروں میں اس کی عالی ہمتی اور راسخ الاعتقادی کھٹکتی تھی۔ چنانچہ ایک فدائی کے ہاتھ سے شہید ہوا۔ یہی سانحہ اس کے بیٹے فخر الملک کو پیش آیا۔ اس طرح کے اس زمانے میں کئی واقعات ہوئے۔ مصر میں تو باطنیوں کی حکومت قائم ہو گئی۔ باطنیہ کا مسئلہ بڑا پیچیدہ اور ہمہ گیر تھا۔ اس کا سیاسی حل تو اس عہد کے مدبروں اور حکام کو کرنا پڑا لیکن وہ کافی نہ تھا۔ اہل علم کی اعانت بھی ضروری تھی۔ چنانچہ خلیفۂ وقت مستظہر باللہ نے

امام صاحب سے فرمائش کی کہ فرقۂ باطنیہ کے رد میں کتاب لکھیں۔ انھوں نے ایک مفصل کتاب لکھی۔ اور خلیفہ کے نام کی رعایت سے کتاب کا نام بھی مستظہری رکھا۔ (الغزالی ص ۲۱) معلوم ہوتا ہے امام صاحب کی اس مسئلہ پر خاص توجہ تھی۔ الغزالی میں عقائد و کلام کی جن دس کتابوں کی فہرست دی گئی ہے (ص ۱۷۰-۱۷۱) ان میں سے چار فرقۂ باطنیہ کے رد میں لکھی گئیں۔ ان میں سے مستظہری کا ہم ذکر کر چکے ہیں۔ باقی تین کے نام ہیں۔ حجۃ الحق، مفصل الخلاف اور قاصم الباطنیہ۔

فرقہ باطنیہ کے خلاف امام غزالی کی علمی کوششوں کی کامیابی کی ایک وجہ یہ بھی تھی کہ انھوں نے عام اشاعرہ کے خلاف اپنے نقطۂ نظر میں عقل سمجھ کو بھی بڑی جگہ دی تھی۔ اور علم و حکمت کا وہ حصہ جو اسلام سے متناقض نہ تھا، قبول کر لیا تھا۔ یوں تو طریقۂ باطنیہ عجیب و غریب عقائد اور اصول و آئین کا ملغوبہ تھا۔ اور امام کو بے پناہ اختیارات دیے گئے تھے لیکن اس طریقے میں لچک کافی تھی۔ اس میں علم کی بھی سرپرستی ہو جاتی تھی (جامعۂ ازہر کی بنیاد باطنیوں کی مرہونِ منت تھی) اور عقل و حکمت کے لیے بھی گنجائش نکل آتی تھی۔ اشاعرہ احکام شرعی میں مصلحتیں ڈھونڈنے کے مخالف تھے۔ اور احکام و روایات کی ترجمانی میں سطحی اور ظاہری معنی مراد لیتے تھے۔ امام غزالی نے اشاعرہ کے اس مسلک سے کہ احکام شریعت کی خوبیاں ڈھونڈنا غیر ضروری ہے عملی طور پر اختلاف کیا۔ بقول شبلی "ان کی کتاب احیاء العلوم سرتاپا اسی مسئلہ کے ابطال میں ہے۔ اس کتاب میں شریعت کے تمام احکام کے مصالح، اسرار اور وجوہ بیان کیے ہیں، جس کے یہ معنی ہیں کہ شریعت نے جن چیزوں کا حکم دیا، اسی وجہ سے دیا کہ وہ واقعہ میں بہتر اور عمدہ تھی۔" (الغزالی ص ۱۸۰)۔

اس کے علاوہ حکمت و فلسفہ میں جو باتیں اسلام کے خلاف نہ تھیں اور مفید تھیں، انھیں امام صاحب نے اختیار کر لیا۔ انھوں نے فلاسفہ کے رد میں اپنی شہرۂ آفاق کتاب تہافۃ الفلاسفہ لکھی۔ لیکن انھوں نے خود فلسفیوں کی کئی قابل قبول چیزیں اخذ کر لیں۔ اور جیسا کہ علامہ شبلی نے الغزالی میں اقتباسات دے کر بتایا ہے، اخلاقی مسائل پر احیاء العلوم کے کئی اندراجات علامہ ابن مسکویہ کی کتاب تہذیب الاخلاق سے ماخوذ ہیں (اور ابن مسکویہ کا بیان یونانی فلسفی

برونسن کی کتاب پر مبنی ہے)۔ معلوم ہوتا ہے کہ اس سلسلے میں امام صاحب پر ان کی زندگی میں ہی اعتراض ہوئے تھے۔ اور انھوں نے المنقذ من الضلال میں اس کا تفصیلی جواب دیا:

میری بعض تصانیف جو اسرار علوم دین میں ہیں (یعنی احیاء العلوم)، ان کے متعلق بعض لوگوں نے جو علم میں پختہ کار نہیں ہیں۔ اور مذہب کے منتہائے مقصود تک ان کی نگاہیں نہیں پہنچیں، یہ اعتراض کیا کہ ان میں بہت سی باتیں حکمائے قدیم سے ماخوذ ہیں۔ حالانکہ ان میں سے بعض باتیں تو خود میری طبع زاد ہیں۔ اور ممکن ہے کہ قدم پر قدم پڑ گیا ہو (یعنی قدما سے توارد ہو گیا ہو)، اور بعض کتب شرعیہ میں موجود ہیں۔ اور اکثر باتیں ایسی ہیں جن کی اصل صوفیہ کی کتابوں میں موجود ہے۔[۵۶]

المنقذ کی اصل عربی عبارت اور مندرجہ بالا اردو ترجمہ درج کرنے کے بعد علامہ شبلی نے احیاء العلوم اور تہذیب الاخلاق (از ابن مسکویہ) کی عبارتیں بالمقابل دے کر یہ ظاہر کیا ہے کہ معاملہ "توارد" سے زیادہ تھا۔ پھر آگے چل کر لکھتے ہیں۔ توارد کا عذر صحیح ہو یا نہ ہو۔ لیکن اس ضمن میں امام صاحب نے ایک ایسی سچی بات کہی جو آب زر سے لکھنے کے قابل ہے [یعنی علامہ کو امام صاحب کے طریق کار سے پورا پورا اتفاق تھا]۔

فرماتے ہیں:

اچھا فرض کرلو کہ جو باتیں میں نے لکھیں، وہ حکما کی کتابوں کے سوا اور کہیں نہیں پائی جاتیں۔ لیکن اگر وہ باتیں معقول ہیں۔ اور دلائل سے ثابت ہیں۔ اور قرآن مجید اور حدیث شریف کے خلاف نہیں ہیں تو پھر ان کے چھوڑنے اور ان سے انکار کرنے کی کیا وجہ ہے۔ اگر ہم ایسا کرنے پر آئیں۔ اور تمام سچی باتوں کو رد کر دیا کریں جو پہلے کسی بدعقیدہ کے خیال میں گزریں تو ہم کو بہت سی سچی اور حق باتوں کو چھوڑ دینا پڑے گا۔[۵۷]

امام غزالیؒ کا یہ طریق کار عمومی تھا۔ فقط خیالات اور اقوال تک محدود نہ تھا۔ اخلاق و اعمال کے سلسلے میں وہ بالوضاحت لکھتے ہیں کہ جن باتوں کے متعلق کوئی نہی عام نہیں، انھیں اختیار کرنے میں کوئی ہرج نہیں۔ خواہ وہ رسول اکرمؐ کے زمانے میں رائج تھیں یا نہیں۔ احیاء العلوم میں لکھتے ہیں:

---

۵۶ الغزالی ص ۳۰۳ [ہم نے فقط "اسرار شریعت" کی جگہ "اسرار علوم الدین" لکھا ہے۔ اصل عربی میں یہی ترکیب ہے اور ہمارے خیال میں زیادہ جامع ہے۔ اکرام]

۵۷ ایضاً ۳۰۵-۳۰۶

کسی کے لیے تعظیماً کھڑا ہو جانا عرب کا طریقہ نہ تھا۔ چنانچہ صحابہ بھی بعض اوقات آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے لیے کھڑا نہیں ہوتے تھے، جیسا کہ حضرت انس سے مروی ہے۔ لیکن چونکہ اس کے متعلق کوئی نہی عام وارد نہیں ہے۔ اس لیے جن ملکوں میں اس کا رواج ہے۔ ہمارے نزدیک وہاں قیام تعظیمی کرنا کچھ مضائقہ کی بات نہیں۔ کیونکہ اس سے مقصود تعظیم و تکریم ہے۔ اور اس سے دل خوش ہوتے ہیں۔ اور اس قسم کی اور باتیں بھی جو کسی قوم میں رواج پا گئی ہیں، جن سے دل خوش ہوتا ہو، جائز بلکہ مستحسن ہیں۔ البتہ جس فعل کے متعلق کوئی ایسی نہی وارد ہوئی ہے، جس کی تاویل نہیں ہو سکتی تو وہ بیشک ناجائز ہے۔[۵۸]

اسی طرح احیاء کے باب الطعام میں ان چیزوں (مثلاً کھانے کی میز، صندلیاں، چھلنی، اشنان[۵۹]) کا ذکر ہے جو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے بعد ایجاد ہوئیں۔ اور جنھیں قدمانے "بدعت" قرار دیا تھا۔ اس سلسلے میں احیا کی متعلقہ عبارت کا "لفظی ترجمہ" الغزالی میں دیا ہے:

گو دسترخوان پر کھانا اچھا ہے۔ لیکن اس کے یہ معنی نہیں کہ صندلی پر کھانا مکروہ یا حرام ہے۔ کیونکہ اس قسم کا کوئی حکم شریعت میں وارد نہیں۔

باقی یہ امر کہ جو چیزیں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے بعد ایجاد ہوئیں تو یہ کوئی کلیہ نہیں کہ ایجاد بدعت ہے۔ بدعت ناجائز صرف وہ ہے جو کسی سنت کے مخالف ہو۔ یا جس سے شریعت کا کوئی حکم باوجود بقائے علت کے باطل ہو جائے۔ ورنہ حالات کے اقتضا کے موافق بعض ایجادات مستحب اور پسندیدہ ہیں۔ صندلی پر کھانے میں صرف یہ بات ہے کہ کھانا زمین سے ذرا اونچا ہو جاتا ہے۔ اور کھانے میں آسانی ہوتی ہے۔ اور یہ کوئی ممنوع امر نہیں۔[۶۰]

امام غزالی نے ان معاملات میں فقط وہی طریق کار اختیار کیا جو قرون اولیٰ میں حضرت عمر فاروقؓ اور دوسرے صحابہ کبار کا تھا۔ یعنی خذ ما صفا ودع ما کدر لیکن[۶۱] اب اس طرز عمل کے اختیار کرنے میں کئی مشکلیں پیدا ہو گئی تھیں۔ ایک تو یہ کہ اب اسلامی فکر و عمل میں وہ سادگی باقی نہ رہی تھی جو اسے خلفائے راشدین

---

۵۸ الغزالی ص ۹۹ ۵۹ "ایک گھاس کا نام ہے جو صابون کے بجائے ہاتھ دھونے کے وقت استعمال کی جاتی تھی"۔

۶۰ الغزالی ص ۹۸-۹۹۔ علامہ شبلی اس بحث کے شروع میں لکھتے ہیں کہ "اس نکتہ کو ہر جگہ ملحوظ رکھا جائے کہ شارع کے کونسے افعال رسالت کی حیثیت سے تعلق رکھتے ہیں اور کونسے معاشرت اور عادت کی حیثیت سے (ص ۹۶-۹۷)۔

۶۱ جو چیزیں حضرت عمرؓ نے دوسروں مثلاً مجوسیوں سے اخذ کیں۔ یا ان امور میں شارع کا جو عمل تھا۔ اس کے لیے ملاحظہ ہو علامہ شبلی کا اہم مقالہ "غیر قوموں کی مشابہت" (مقالات شبلی جلد اول ص ۱۷۲-۱۷۸)۔

کے زمانے میں بلکہ پہلی صدی ہجری تک حاصل تھی۔ بعد کی تین چار صدیوں میں کئی اسلامی امور مثلاً فقہ اور حدیث کی تدوین ہو چکی تھی۔ اور اسلامی فکر و عمل کا ایک اچھا خاصا ڈھانچہ مرتب ہو چکا تھا۔ اب نئی چیزوں کے اخذ کرنے کی ضرورت بھی کم ہو گئی تھی۔ اور جہاں اس کی ضرورت اور گنجائش تھی، وہاں بھی اس عمل کے اختیار کرنے میں تامل بلکہ تکدر کا اظہار ہوتا۔ دوسری بڑی مشکل یہ تھی کہ عقل کے نام نہاد ترجمانوں یعنی معتزلیوں نے اپنے زمانۂ اقتدار میں اپنے مخالفین مثلاً امام احمد بن حنبلؒ کے ساتھ اس طرح کا ظالمانہ سلوک کیا تھا کہ اب ان کے نقطۂ نظر کے خلاف ایک زبردست ردِ عمل ہوا۔ اور ایسی فضا پیدا ہو گئی، جس میں اعتدال اور خذ ما صفا ودع ما کدر کے اصول کا فروغ پانا بڑا مشکل تھا۔ ان حالات میں اس اصول کو اپنانے کے لیے بڑی جرأت، فرض شناسی اور انسان دوستی کی ضرورت تھی۔ خوش قسمتی سے امام صاحب میں یہ سب خوبیاں بدرجۂ اتم موجود تھیں۔ چنانچہ انھوں نے اس اصول کو چراغِ راہ بنایا۔ ان کے زمانے میں یونان کے علوم عقلیہ کی اشاعت نے ایک زبردست فکری بحران پیدا کر دیا تھا۔ حکومت عباسیہ نے ان علوم کی پشت پناہی کی۔ اور ان کی زبردست اشاعت ہوئی۔ لیکن با اثر مذہبی حلقے ان کے سخت مخالف تھے۔ اس کش مکش کا خاتمہ امام غزالی نے خذ ما صفا ودع ما کدر کے اصول پر کیا۔ انھوں نے اس خیال کی سختی سے مخالفت کی کہ حکمت و معقولات ہی سب کچھ ہیں۔ اور انسان رہنمائی کے لیے انبیا کا محتاج نہیں۔ لیکن ان علوم میں جو باتیں مفید مطلب تھیں اور اسلامی احکام سے متعارض نہ تھیں انھیں اخذ کر لیا۔ مثلاً منطق جو محض انضباط ذہنی کا ایک آلۂ کار ہے، اسے سیکھنے سکھانے کی تائید کی۔ اور علم الاخلاق (Ethics) کے متعلق قدیم حکما کے خیالات بڑی وسعت سے اختیار کیے۔ بلکہ امام صاحب کا تو کہنا تھا کہ ان خیالات کا اصل سرچشمہ انبیائے کرام کی تعلیمات تھیں۔ جنھیں حکما نے اپنا کر ان میں اضافہ کیا۔ اور نئے برگ و بار پیدا کیے۔

امام غزالی نے نہ صرف خذ ما صفا ودع ما کدر کے قدیم اسلامی اصول کو تازہ کر کے اس کش مکش کو رفع کیا، جو عہد عباسیہ میں علوم عقلیہ کی اشاعت سے پیدا ہو گئی تھی۔ بلکہ انھوں نے شدت سے اس خیال کی تردید کی کہ علوم عقلیہ اور علوم شرعیہ میں تناقض ہے۔ دونوں کو جمع کرنا محال ہے۔ اس سلسلے میں علامہ شبلی نے الغزالی میں احیا کے متعلقہ اندراج کا جو ترجمہ کیا وہ تمام کا تمام نقل کرنے کے قابل ہے:

عقل و نقل کی تطبیق

بعض لوگوں کا خیال ہے کہ علوم عقلیہ اور علوم شرعیہ میں تناقض ہے اور دونوں کو جمع کرنا محال ہے۔ لیکن یہ خیال کور فہمی کی وجہ سے پیدا ہوتا ہے۔ نعوذ باللہ منہ۔ اس خیال کے آدمی کو خود علوم شرعیہ میں جہاں بظاہر تناقض نظر آئے گا۔ اور وہ اس کی توجیہ نہ کر سکے گا تو وہ یہی خیال کرے گا کہ مذہب کی باتوں میں تناقض پایا جاتا ہے۔

[اسی باب میں اس عبارت سے پہلے لکھتے ہیں:]

جو شخص عقل کو بالکل معزول کر کے محض تقلید کی طرف لوگوں کو بلاتا ہے، وہ جاہل ہے۔ اور جو شخص صرف عقل پر بھروسہ کر کے قرآن و حدیث سے بے پروا بنتا ہے وہ مغرور ہے۔ خبردار! تم ان میں سے ایک فریق نہ بن جانا۔ تم کو دونوں کا جامع ہونا چاہیے۔ کیونکہ علوم عقلیہ غذا کی طرح ہیں اور علوم شرعیہ دوا کی طرح۔[۱۲]

عقل و نقل کی تطبیق کے علاوہ امام صاحب نے قوم کے فکری مناقشات کم کرنے کی دوسری کئی کوششیں کیں۔ جب وہ بغداد پہنچے تو یہ شہر، بقول شبلی، "دنیا بھر کے عقائد اور خیالات کا دنگل تھا۔" دوسرے مذاہب اور شیعہ فرقوں سے قطع نظر، خود سنیوں میں سخت اختلافات تھے۔ ان میں معتزلیوں کے علاوہ "اشعریہ و حنابلہ" تھے۔ "جو آپس میں ضد بہ یک دیگر تھے۔ اور جن میں اختلاف عقائد کی بنا پر بارہا خونریزیاں ہو چکی تھیں۔"[۱۳]

امام غزالی نے ان اختلافات کو کم کرنے یا کم از کم خوشگوار حدود میں لانے کے لیے پہلا قدم یہ اٹھایا کہ مناظروں کے خلاف، جن سے اختلافات کی آگ تیز ہوتی تھی، آواز اٹھائی۔ خود مناظروں میں حصہ لینا بند کر دیا۔ اور اپنی کتابوں میں شدت کے ساتھ مناظرہ بازی کے خلاف اظہار خیال کیا۔ احیاء العلوم میں ایک مستقل باب آفات المناظرۃ والجدل کی تفصیلات کے لیے وقف ہے۔ اس میں دکھایا گیا ہے کہ مناظروں سے کس طرح تفاخر، حسد، رشک، ضد، فضول گوئی اور قساوت قلب کا آغاز ہوتا ہے۔[۱۴] اس باب کے علاوہ اور کئی جگہ اسی طرح کا اظہار خیال ہے۔ ایک اندراج میں جو الغزالی میں تمام کا تمام نقل ہوا ہے[۱۵] بتایا ہے کہ اگر لوگ مخالفوں سے نرمی، ملائمت اور لطف سے کام لیں۔ اور انھیں تنہائی میں

---

۱۲ الغزالی، ص ۲۵۱-۲۵۲

۱۳ ایضاً ص ۲۴۸-۲۴۹

۱۴ ایضاً ص ۲۷۲-۲۷۴

۱۵ ایضاً ص ۲۵۰

خیرخواہی کے طور پر سمجھائیں تو اپنے مقصد میں کامیاب ہوں۔ لیکن چونکہ اس سے شان و شوکت اور خود نمائی کا اظہار نہیں ہوتا۔ " حمایت مذہب اور مدافعت عن الاسلام" کے نام پر دوسرے طریقے اختیار کرتے ہیں، جن میں تباہی ہی تباہی ہے۔ فقہ کا وہ حصہ، جسے فقہا کی اصطلاح میں خلافیات سے تعبیر کیا جاتا ہے، اس کے متعلق بھی ان کا ارشاد ہے:

[فقہی مناظرات سے احتراز]

باقی خلافیات جو اخیر زمانے میں پیدا ہو گئے ہیں۔ تو خبردار اس کے پاس تک نہ پھٹکنا۔ اور اس سے اس طرح بچنا جس طرح زہر قاتل سے بچتے ہیں۔

مناظروں کی مخالفت کے علاوہ امام صاحب نے دوسرا بڑا کام یہ کیا کہ اختلافی مسائل میں ایک دوسرے کی تکفیر کی مذمت کی۔ اور اپنے رسالہ التفرقہ بین الاسلام والزندقہ میں ان شرائط کی تفصیل دی جن کے بغیر کسی کی تکفیر درست نہیں۔ انھوں نے بتایا کہ جو شخص یہ سمجھتا ہے کہ اس کے فرقہ کے امام سے جو شخص اختلاف کرتا ہے، وہ کافر ہے، وہ اندھا مقلد ہے۔ اور اس کا بیان قابل اعتنا نہیں بلکہ

اگر تم انصاف کرو تو معلوم ہوگا کہ جو شخص حق کو [رسول اکرمؐ کے علاوہ] کسی شخص خاص میں محدود سمجھتا ہے، وہ خود کفر کے قریب ہے۔ کیونکہ اس نے اس شخص کو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی طرح معصوم قرار دیا۔[۱۶]

کسی کو کافر قرار دینے کے متعلق انھوں نے ایک بنیادی اصول بیان کیا ہے:

غالباً تم کو کفر کے معیار کے جاننے کی خواہش ہوگی۔ تو میں ایک قاعدہ کلیہ بتاتا ہوں۔ کفر کے معنی صرف یہ ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی تکذیب کی جائے۔ ان چیزوں میں جو ان پر خدا کی طرف سے آئی۔[۱۷]

رسالہ میں آگے چل اس اجمال کی تفصیل دی ہے۔ اور کسی کو کافر قرار دینے میں جس احتیاط کی ضرورت ہے، اس کی وضاحت کی ہے۔ اسی انداز خیال کا اظہار ان کی دوسری تصانیف میں بھی ہے مثلاً جن مسائل کی بنا پر اشاعرہ معتزلہ کو اور معتزلہ اشاعرہ کو کافر کہتے تھے۔ امام صاحب نے خود بھی ان تمام مسائل میں ایک خاص پہلو اختیار کیا۔ لیکن یہ ظاہر کر دیا کہ یہ مسائل کفر و اسلام کا معیار نہیں۔[۱۸] اسی طرح " قدریہ اور جبریہ کو عام طور پر مجوسی، جہنمی اور ناری کہا جاتا تھا۔ امام صاحب نے اپنے

---

۱۶ ایضاً ص ۱۸۴ ۱۷ ایضاً ۱۸ ایضاً ۲۲۴

رسالہ املار فی مشکلات الاحیا میں صرف تصریح کی کہ وہ دائرۂ اسلام سے خارج نہیں۔[۵۰] مشکلات الاحیا میں اس مسئلے پر تفصیل سے بحث کی اور لکھا کہ "ان لوگوں کو گو اکثروں نے کافر کہا ہے . . . . لیکن جن لوگوں نے ان کو مسلمان قرار دیا یا جن لوگوں کو ان کے اسلام اور کفر میں تردد ہے، ان کی تعداد بھی کچھ کم نہیں بلکہ کافر کہنے والوں سے زیادہ ہے۔ اور یہ دونوں ایک دوسرے کے فریق مقابل ہیں۔ ان کا فیصلہ اس حاکم کے دربار میں ہوگا، جو سب سے بڑا عالم اور دانا ہے۔"[۵۲]

اس کے بعد تکفیر کے متعلق تفصیلی مباحث پر امام صاحب کی رائے کا خلاصہ دے کر علامہ شبلی لکھتے ہیں:

غرض تکفیر کی جو جو وجہیں لوگوں نے قائم کی تھیں۔ امام صاحب نے سب کو رد کیا۔ اور قطعی دلائل سے ثابت کیا کہ تمام کلمہ گو مسلمان ہیں اور اسلامی حیثیت سے بھائی بھائی ہیں۔ آپس میں جو اختلافات ہیں، وہ اصل اسلام سے تعلق نہیں رکھتے بلکہ اجتہادی اور فرعی باتیں ہیں جن کی حد اس سے آگے نہیں بڑھتی۔ کہ ان میں ایک صحیح ہو اور دوسری غلط۔ . . . .

امام صاحب کی اس فیاض طبعی پر اگرچہ ابتدا میں بہت مخالفت ہوئی۔ لیکن بالآخر یہ علم کلام کا مسئلہ مسلّمہ بن گیا کہ اہل قبلہ جس قدر ہیں سب مسلمان ہیں۔ چنانچہ علم کلام کی تمام کتابوں کا خاتمہ اسی مسئلہ پر ہوتا ہے۔

امام غزالی کے طریق کار کا جو عملی نتیجہ تھا، اس کا بیان شبلی کی زبان سے سنیے:

عملی طور پر امام صاحب کی کوشش کا جو اثر ہوا وہ یہ تھا کہ اشعریہ و حنابلہ جو آپس میں ضد یک دیگر تھے۔ اور جن میں اختلاف عقائد کی بنا پر بارہا خونریزیاں ہو چکی تھیں، رفتہ رفتہ ان کا اختلاف کم ہوتا گیا۔ یہاں تک کہ بجز بعض مستثنیات کے اشاعرہ اور حنابلہ باہم شیر و شکر ہو گئے۔

دار الخلافہ بغداد کے سنی و شیعہ میں بھی ۵۰۲ھ میں صلح ہو گئی۔ اور وہ خونریزیاں جن کی بدولت بغداد کے محلے کے محلے برباد ہو گئے تھے، دفعۃً رک گئیں[۵۳]

---

[۵۰] ایضاً

[۵۱] ایضاً ص ۲۴۴-۲۴۵

[۵۲] ایضاً ص ۲۴۸-۲۴۹